PD – JULY 2025
اجتماعی مطالعہ قرآن ۔ جولائی ۲۰۲۵

سورہ الشوری۔۔۔ آیت ۳۶ تا ۴۳

آیت۔۔۔۳۶

فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۳۶

جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سر و سامان ہے، 55 اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی 56۔ وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں

تفسیر تفہیم القرآن۔ مولانا مودودی

سورۃالشُّوریٰ حاشیہ نمبر :55

یعنی یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر آدمی پھول جائے۔ بڑی سے بڑی دولت بھی جو دنیا میں کسی شخص کو ملی ہے، ایک تھوڑی سی مدت ہی کے لیے ملی ہے۔ چند سال وہ اس کو برت لیتا ہے اور پھر سب کچھ چھوڑ کر دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہو جاتا ہے۔ پھر وہ دولت بھی چاہے بہی کھاتوں میں کتنی ہی بڑی ہو، عملاً اس کا ایک قلیل سا حصہ ہی آدمی کے اپنے استعمال میں آتا ہے۔ اس مال پر اترانا کسی ایسے انسان کا کام نہیں ہے جو اپنی اور اس مال و دولت کی، اور خود اس دنیا کی حقیقت کو سمجھتا ہو۔

سورۃالشُّوریٰ حاشیہ نمبر :56

یعنی وہ دولت اپنی نوعیت و کیفیت کے لحاظ سے بھی اعلیٰ درجے کی ہے، اور پھر وقتی و عارضی بھی نہیں ہے بلکہ ابدی اور لازوال ہے۔

تفسیر تدبر القرآن ۔۔۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب

خلاصہ بحث

یہ آخر میں اوپر والی بحث کا خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے کہ یہ دنیا کی جو نعمتیں تمہیں ملی ہیں، اترانے اور فخر کرنے کی چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ اس حیات چند روزہ کی متاع ہیں۔ ایک دن بالآخر یہ زندگی بھی ختم ہو جائے گی اور اس کا یہ سرور سامان بھی۔ البتہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے وہ اس سے کہیں بہتر اور ابدی ہے جو ان لوگوں کا حصہ ہے جو ایمان لائے اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر حوصلہ ہے تو اس کے چاہنے والے بنو۔ اس دنیا کی متاع حقیر کے پیچھے کیوں اپنی عاقبت برباد کر رہے ہو۔

یہاں وعلی ربھم یتوکلون کے الفاظ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ اس حقیت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جو لوگ آخرت کی ابدی بادشاہی کے طالب ہوں ان کے لیے اس راہ میں اصلی زادِ راہ توکل ہے۔ جب تک کسی کے اندر یہ حوصلہ نہ ہو کہ اس دنیا کی جو چیزیں خدا کی راہ میں مزاحم ہوں ان کو خدا کے بھروسہ اور آخرت کے صلہ کے اعتماد پر طلاق دے سکے اس وقت تک کوئی شخص یہ ابدی بادشاہی حاصل نہیں کر سکتا۔

آیت۔۔۔۳۷

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۳۷

اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں 57، جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں 58 اور اگر غصہ آجائے تو در گزر کر جاتے ہیں 59،

تفسیر تفہیم القرآن۔ مولانا مودودی

سورۃالشّوریٰ حاشیہ نمبر :57

اللہ پر توکل کو یہاں ایمان لانے کا لازمی تقاضا، اور آخرت کی کامیابی کے لیے ایک ضروری وصف قرار دیا گیا ہے۔ توکل کے معنی یہ ہیں کہ : اولاً، آدمی کو اللہ تعالیٰ کی رہنمائی پر کامل اعتماد ہو اور وہ یہ سمجھے کہ حقیقت کا جو علم، اخلاق کے جو اصول، حلال و حرام کے جو حدود، اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جو قواعد و ضوابط اللہ نے دیے ہیں وہی بر حق ہیں اور انہی کی پیروی میں انسان کی خیر ہے۔ ثانیاً، آدمی کا بھروسہ اپنی طاقت، قابلیت، اپنے ذرائع و وسائل، اپنی تدابیر، اور اللہ کے سوا دوسروں کی امداد واعانت پر نہ ہو، بلکہ وہ پوری طرح یہ بات ذہن نشین رکھے کہ دنیا اور آخرت کے ہر معاملے میں اس کی کامیابی کا اصل انحصار اللہ کی توفیق و تائید پر ہے، اور اللہ کی توفیق و تائید کا وہ اسی صورت میں مستحق ہو سکتا ہے جبکہ وہ اس کی رضا کو مقصود بنا کر، اس کے مقرر کی ہوئے حدود کی پابندی کرتے ہوئے کام کرے۔ ثالثاً، آدمی کو ان وعدوں پر پورا بھروسہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے ایمان و عمل صالح کا رویہ اختیار کرنے والے اور باطل کے بجائے حق کے لیے کام کرنے والے بندوں سے کیے ہیں، اور ان ہی وعدوں پر اعتماد کرتے ہوئے وہ ان تمام فوائد اور منافع اور لذائذ کو لات مار دے جو باطل کی راہ پر جانے کی صورت میں اسے حاصل ہوتے نظر آتے ہوں، اور ان سارے نقصانات اور تکلیفوں اور محرومیوں کو انگیز کر جائے جو حق پر استقامت کی وجہ سے اس کے نصیب میں آئیں۔ توکل کے معنی کی اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان کے ساتھ اس کا کتنا گہرا تعلق ہے، اور اس کے بغیر جو ایمان محض خالی خولی اعتراف و اقرار کی حد تک ہو اس سے وہ شاندار نتائج کیوں نہیں حاصل ہو سکتے جن کا وعدہ ایمان لا کر توکل کرنے والوں سے کیا گیا ہے۔

سورۃالشّوریٰ حاشیہ نمبر :58

تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، النساء، حواشی ۵۳۔ ۵۴، الانعام، حواشی ۱۳۰، ۱۲۱، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۸۹، نیز سورۃ نجم، آیت ۳۲۔

سورۃالشّوریٰ حاشیہ نمبر :59

یعنی وہ غصیل اور جھلے نہیں ہوتے، بلکہ نرم خو اور دھیمے مزاج کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی سرشت انتقامی نہیں ہوتی بلکہ وہ بندگان خدا سے در گزر اور چشم پوشی کا معاملہ کرتے ہیں، اور کسی بات پر غصہ آ بھی جاتا ہے تو اسے پی جاتے ہیں۔ یہ وصف انسان کی بہترین صفات میں سے ہے جسے قرآن مجید میں نہایت قابل تعریف قرار دیا گیا ہے (آل عمران، آیت 134) اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کامیابی کے بڑے اسباب میں شمار کیا گیا ہے۔ (آل عمران، 159)۔ حدیث میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ : ماانتقم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لنفسہ فی شئی قط الا ان تنتھک حرمۃ اللہِ (بخاری و

مسلم)۔ "رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کبھی اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیا۔ البتہ جب اللہ کی حرمتوں میں سے کسی حرمت کی ہتک کی جاتی تب آپ سزا دیتے تھے۔"

تفسیر تدبر القرآن ۔۔۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب

-6 آگے کا مضمون ۔۔ آیات 37-43

آگے کی آیات میں مذکورہ بالا اجر کے مستحقین کی کچھ اور صفتیں بیان فرمائی ہیں جن سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو مسلمان اس دور میں قریش کے مغروروں کے ہاتھوں ہر قسم کے مظالم کا ہدف بنے ہوئے تھے یہاں تک کہ ان کے مظالم سے تنگ آکر اپنے گھر ور چھوڑنے پر مجبور ہو رہے تھے، وہی اس کے اصلی حق دار ہیں۔ یہ سورۃ، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، ہجرت کے بالکل قریب نازل ہوئی ہے اس وجہ سے ان صفات کے بیان کا انداز کچھ اس طرح کا ہے جس میں مسلمانوں کے لیے فتح یاب کی بشارت بھی ہے اور آگے کے مراحل میں ان کے فرائض اور ان کی ذمہ داریوں سے متعلق بعض ضروری ہدایات بھی گویا ہجرت سے پہلے ان کو یہ بتا دیا گیا کہ اب تک وہ منتشر افراد کی صورت میں تھے اب اللہ تعالیٰ ان کو ایک ہئیت اجتماعی و سیاسی میں منظم کرنے کی شکل پیدا کر رہا ہے۔ اب تک وہ مظلوم تھے لیکن اب وقت آ رہا ہے کہ وہ اپنی مدافعت کی قوت بھی حاصل کریں گے اور اس کے لیے اللہ کی طرف سے مجاز بھی ہوں ۔۔ ان پیش آنے والے حالات میں ان کو کیا رویہ اختیار کرنا ہے اس کی طرف ان آیتوں میں رہنمائی کی گئی ہے لیکن اس رہنمائی کا انداز امر و حکم کا نہیں بلکہ ایمان اور توکل کے لازمی مقتضیات کے بیان کا ہے ۔۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

-7 الفاظ کی تحقیق اور آیات کی واضحت

والذین یجتنبون کبیرا لاثم والفواحش واذا ماغضبوا ھم یغفرون(37)

برائیوں کے تین عنوان

یعنی یہ ان لوگوں کی طرح نہیں ہیں جو خدا کی نعمتیں پا کر ظلم، بے حیائی اور بغی و طغیان میں مبتلا ہوئے ہیں بلکہ وہ حق تلفی، بے حیائی اور غصہ وانتقام کی قسم کے تمام بڑے جرائم سے اجتناب کرنے والے ہیں۔ اس اسلوب بیان میں مخالف گروہ پر جو تعریض ہے وہ وضاحت کی محتاج نہیں ہے اور غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہاں تمام برائیوں کو تینع نوانوں کے تحت سمیٹ دیا گیا۔ اثم، فحتساء اور غضب ۔۔ اثم سے مراد وہ برائیاں ہیں جو حق تلفی، ناانصافی اور ظلم کی نوعیت کی ہوں۔ فحشاء سے وہ برائیاں مراد ہیں جو شہوات اور خواہشات نفس کی راہ سے ابھری ہیں۔ غضب، انانیت، خود سری اور استکبار سے وجود میں آتا ہے اور طغیان و فساد اور بغی و جبر کو جنم دیتا ہے۔

یہاں ان برائیوں کے صرف کبائر سے بچتے رہنے کا ذکر ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ انسان خیر و شر کے دو متضاد داعیات کی کشمکش کے اندر امتحان میں ڈالا گیا ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کا مطالبہ اس سے یہ نہیں ہے کہ وہ بالکل معصوم ہو کر زندگی گزارے۔ اگر یہ بوجھ اس پر ڈالا جاتا تو یہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے صرف یہ چاہا ہے کہ وہ بڑے گناہوں سے بچنے کی پوری کوشش کرے۔ اگر وہ بڑی برائیوں سے بچتا رہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی چھوٹی غلطیوں سے در گزر فرمائے گا۔

دوسری یہ کہ چھوٹی برائیوں سے بچنے کا بھی صحیح طریقہ یہی ہے کہ آدمی بڑی برائیوں سے اجتناب کرے۔ جو شخص بڑی بڑی امانتیں ادا کرتا ہے اس کا ضمیر اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتا کہ وہ کسی کی چھوٹی سی امانت میں خیانت کر کے فائن کہلانے کا ننگ گوارا کرے۔ اسی طرح اللہ کا جو بندہ بڑی برائیوں سے اپنے کو بچاتا ہے وہ یہ نہیں پسند کرتا کہ چھوٹی چھوٹی برائیوں کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اجر کو برباد کرے۔ جو شخص اشرفیوں کی چوری سے اجتناب کرے گا وہ دھیلے اور پیسے کی چوری کرنے والا نہیں بنے گا۔ اگر اس طرح کی کوئی حرکت اس سے صادر ہو گی بھی تو سہواً ہی ہو گی، عملاً نہیں ہو گی۔ البتہ جو لوگ مچھر کو چھانتے ہیں ان کو اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ اونٹ کو نگل جانے والے ہوتے ہیں۔

واذا ماغضبوا ھم یغفرون کے اسلوب بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ جہاں تک غصہ کے آنے کا تعلق ہے وہ تو ان کو آتا ہے اس لیے کہ غصہ انسان کی حمیت، غیرت اور عزت نفس کا ایک فطری تقاضا ہے لیکن یہ نہیں ہوتا کہ وہ اس غصہ سے بے قابو ہو کر اپنی عقل سے دست بردار اور خدا کے حدود سے متجاوز

ہو جائیں بلکہ وہ اپنے آپ کو کنڑول میں رکھتے ہیں اور ان لوگوں کو معاف کر دیا کرتے ہیں جن کی حرکتیں اگرچہ غصہ دلانے والی ہوتی ہیں لیکن مختلف وجوہ سے وہ مستحق ہوتے ہیں کہ ان سے در گزر کی جائے۔اس میں درپردہ مسلمانوں کو اس بات کی تلقین بھی ہے کہ ہر چند تمہارے دشمنوں کا رویہ نہایت اشتعال انگیز ہے لیکن ابھی یہی بہتر ہے کہ ان سے در گزر کرو یہاں تک کہ ان پر اللہ کی حجت تمام ہو جائے۔آگے کی آیات میں اس کی وضاحت آرہی ہے۔ یہاں ضمیر ھم کے اظہار سے جملہ میں یہ زور پیدا ہو گیا ہے۔ کہ اگرچہ یہ کام ہے نہایت کٹھن لیکن مستحق آفرین ہیں وہ لوگ جو یہ کڑوے گھونٹ حلق سے اتارتے ہیں۔

آیت۔۔۔۳۸

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳۸

جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں 60، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں 61، ہم نے جو کچھ بھی رزق انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں 62،

تفسیر تفہیم القرآن۔ مولانا مودودی

سورۃالشُّوریٰ حاشیہ نمبر :60

لفظی ترجمہ ہو گا "اپنے رب کی پکار پر لبیک کہتے ہیں" یعنی جس کام کے لیے بھی اللہ بلاتا ہے اس کے لیے دوڑ پڑتے ہیں، اور جس چیز کی بھی اللہ دعوت دیتا ہے اسے قبول کرتے ہیں۔

سورۃالشُّوریٰ حاشیہ نمبر :61

اس چیز کو یہاں اہل ایمان کی بہترین صفات میں شمار کیا گیا ہے، اور سورۃ آل عمران (آیت 159) میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔اس بنا پر مشاورت اسلامی طرز زندگی کا ایک اہم ستون ہے، اور مشورے کے بغیر اجتماعی کام چلانا نہ صرف جاہلیت کا طریقہ ہے بلکہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے ضابطے کی صریح خلاف ورزی ہے۔ مشاورت کو اسلام میں یہ اہمیت کیوں دی گئی ہے؟ اس کے وجوہ پر اگر غور کیا جائے تو تین باتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ جس معاملے کا تعلق دو یا زائد آدمیوں کے مفاد سے ہو، اس میں کسی ایک شخص کا اپنی رائے سے فیصلہ کر ڈالنا اور دوسرے متعلق اشخاص کو نظر انداز کر دینا زیادتی ہے۔ مشترک معاملات میں کسی کو اپنی من مانی چلانے کا حق نہیں ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ایک معاملہ جتنے لوگوں کے مفاد سے تعلق رکھتا ہو اس میں ان سب کی رائے لی جائے، اور اگر وہ کسی بہت بڑی تعداد سے متعلق ہو تو ان کے معتمد علیہ نمائندوں کو شریک مشورہ کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ انسان مشترک معاملات میں اپنی من مانی چلانے کی کوشش یا تو اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی اغراض کے لیے دوسروں کا حق مارنا چاہتا ہے، یا پھر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑی چیز اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ اخلاقی حیثیت سے یہ دونوں صفات یکساں قبیح ہیں، اور مومن کے اندر ان میں سے کسی صفت کا شائبہ بھی نہیں پایا جا سکتا۔ مومن نہ خود غرض ہوتا ہے کہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی کر کے خود ناجائز فائدہ اٹھانا چاہے، اور نہ وہ متکبر اور خود پسند ہوتا ہے کہ اپنے آپ ہی کو عقل کل اور علیم و خبیر سمجھے۔

تیسرے یہ کہ جن معاملات کا تعلق دوسروں کے حقوق اور مفاد سے ہو ان میں فیصلہ کرنا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ کوئی شخص جو خدا سے ڈرتا ہو اور یہ جانتا ہو کہ اس کی کتنی سخت جواب دہی اسے اپنے رب کے سامنے کرنی پڑے گی، کبھی اس بھاری بوجھ کو تنہا اپنے سر لینے کی جرات نہیں کر سکتا۔ اس طرح کی جراتیں صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو خدا سے بے خوف اور آخرت سے بے فکر ہوتے ہیں۔ خدا ترس اور آخرت کی باز پرس کا احساس رکھنے والا

آدمی تولازماً یہ کوشش کرے گا کہ ایک مشترک معاملہ جن جن سے بھی متعلق ہو ان سب کو، یا ان کے بھروسے کے نمائندوں کو اس کا فیصلہ کرنے میں شریک مشورہ کرے، تاکہ زیادہ سے زیادہ صحیح اور بے لاگ اور مبنی بر انصاف فیصلہ کیا جاسکے، اور اگر نادانستہ کوئی غلطی ہو بھی جائے تو تنہا کسی ایک ہی شخص پر اس کی ذمہ داری نہ آپڑے۔

یہ تین وجوہ ایسے ہیں جن پر اگر آدمی غور کرے تو اس کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آسکتی ہے کہ اسلام جس اخلاق کی انسان کو تعلیم دیتا ہے، مشورہ اس کا لازمی تقاضا ہے اور اس سے انحراف ایک بہت بڑی بد اخلاقی ہے جس کی اسلام کبھی اجازت نہیں دے سکتا۔ اسلامی طرز زندگی یہ چاہتا ہے کہ مشاورت کا اصول ہر چھوٹے بڑے اجتماعی معاملے میں برتا جائے۔ گھر کے معاملات ہوں تو ان میں میاں اور بیوی باہم مشورے سے کام کریں اور بچے جب جوان ہو جائیں تو انھیں بھی شریک مشورہ کیا جائے۔ خاندان کے معاملات ہوں تو ان میں کنبے کے سب عاقل و بالغ افراد کی رائے لی جائے۔ ایک قبیلے یا برادری یا بستی کے معاملات ہوں اور سب لوگوں کا شریک مشورہ ہونا ممکن نہ ہو، ان کا فیصلہ کوئی ایسی پنچایت یا مجلس کرے جس میں کسی متفق علیہ طریقے کے مطابق تمام متعلق لوگوں کے معتمد علیہ نمائندے شریک ہوں۔ ایک پوری قوم کے معاملات ہوں تو ان کے چلانے کے لیے قوم کا سربراہ سب کی مرضی سے مقرر کیا جائے، اور وہ قومی معاملات کو ایسے صاحب رائے لوگوں کے مشورے سے چلائے جن کو قوم قابل اعتماد سمجھتی ہو، اور وہ اسی وقت تک سربراہ رہے جب تک قوم خود اسے اپنا سربراہ بنائے رکھنا چاہے۔ کوئی ایماندار آدمی زبردستی قسم کا سربراہ بننے اور بنے رہنے کی خواہش یا کوشش نہیں کرسکتا، نہ یہ فریب کاری کر سکتا ہے کہ پہلے بزور قوم کے سر پر مسلط ہو جائے اور پھر جبر کے تحت لوگوں کی رضامندی طلب کرے، اور نہ اس طرح کی چالیں چل سکتا ہے کہ اس کو مشورہ دینے کے لیے لوگ اپنی آزاد مرضی سے اپنی پسند کے نمائندے نہیں بلکہ وہ نمائندے منتخب کریں جو اس کی مرضی کے مطابق رائے دینے والے ہوں۔ ایسی ہر خواہش صرف اس نفس میں پیدا ہوتی ہے جو نیت کی خرابی سے لوث ہو، اور اس خواہش کے ساتھ : اَمۡرُھُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَھُمۡ کی ظاہری شکل بنانے اور اس کی حقیقت غائب کر دینے کی کوششیں صرف وہی شخص کر سکتا ہے جسے خدا اور خلق دونوں کو دھوکا دینے میں کوئی باک نہ ہو، حالانکہ نہ خدا دھوکا کھا سکتا ہے، اور نہ خلق ہی اتنی اندھی ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص دن کی روشنی میں علانیہ ڈاکہ مار رہا ہو اور وہ سچے دل سے یہ سمجھتی رہے کہ وہ ڈاکہ نہیں مار رہا ہے بلکہ لوگوں کی خدمت کر رہا ہے۔

اَمۡرُھُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَھُمۡ کا قاعدہ خود اپنی نوعیت اور فطرت کے لحاظ سے پانچ باتوں کا تقاضا کرتا ہے :

اول یہ کہ اجتماعی معاملات جن لوگوں کے حقوق اور مفاد سے تعلق رکھتے ہیں انھیں اظہار رائے کی پوری آزادی حاصل ہو، اور وہ اس بات سے پوری طرح باخبر رکھے جائیں کہ ان کے معاملات فی الواقع کس طرح چلائے جارہے ہیں، اور انھیں اس امر کا بھی پورا حق حاصل ہو کہ اگر وہ اپنے معاملات کی سربراہی میں کوئی غلطی یا خامی یا کوتاہی دیکھیں تو اس پر ٹوک سکیں، احتجاج کر سکیں، اور اصلاح ہوتی نہ دیکھیں تو سربراہ کاروں کو بدل سکیں۔ لوگوں کا منہ بند کر کے اور ان کے ہاتھ پاؤں کس کر اور ان کو بے خبر رکھ کر ان کے اجتماعی معاملات چلانا صریح بد دیانتی ہے جسے کوئی شخص بھی : اَمۡرُھُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَھُمۡ کے اصول کی پیروی نہیں مان سکتا۔

دوم یہ کہ اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری جس شخص پر بھی ڈالنی ہو اسے لوگوں کی رضامندی سے مقرر کیا جائے، اور یہ رضامندی ان کی آزادانہ رضامندی ہو۔ جبر اور تخویف سے حاصل کی ہوئی، یا تحریص و اطماع سے خریدی ہوئی، یا دھوکے اور فریب اور مکاریوں سے کھسوٹی ہوئی رضامندی در حقیقت رضامندی نہیں ہے۔ ایک قوم کا صحیح سربراہ وہ نہیں ہوتا جو ہر ممکن طریقہ سے کوشش کر کے اس کا سربراہ بنے، بلکہ وہ ہوتا ہے جس کو لوگ اپنی خوشی اور پسند سے اپنا سربراہ بنائیں۔

سوم یہ کہ سربراہ کار کو مشورہ دینے کیلئے بھی وہ لوگ مقرر کیے جائیں جن کو قوم کا اعتماد حاصل ہو، اور ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگ کبھی صحیح معنوں میں حقیقی اعتماد کے حامل قرار نہیں دیے جاسکتے جو دباؤ ڈال کر، یا مال سے خرید کر، یا جھوٹ اور مکر سے کام لیکر، یا لوگوں کو گمراہ کر کے نمائندگی کا مقام حاصل کریں۔

چہارم یہ کہ مشورہ دینے والے اپنے علم اور ایمان و ضمیر کے مطابق رائے دیں، اور اس طرح کے اظہار رائے کی انھیں پوری آزادی حاصل ہو۔ یہ بات جہاں نہ ہو، جہاں مشورہ دینے والے کسی لالچ یا خوف کی بنا پر، یا کسی جتھہ بندی میں کسے ہوئے ہونے کی وجہ سے خود اپنے علم اور ضمیر کے خلاف رائے دیں، وہاں در حقیقت خیانت اور غداری ہوگی نہ کہ : اَمۡرُھُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَھُمۡ کی پیروی۔

پنجم یہ کہ جو مشورہ اہل شوریٰ کے اجماع (اتفاق رائے) سے دیا جائے، یا جسے ان کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو، اسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات میں ان سے مشورہ لیا جاتا ہے" بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں۔" اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو اسی کے مطابق معاملات چلیں۔

اسلام کے اصول شوریٰ کی اس توضیح کے ساتھ یہ بنیادی بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہ شوریٰ مسلمانوں کے معاملات چلانے میں مطلق العنان اور مختار کل نہیں ہے بلکہ لازماً اس دین کے حدود سے محدود ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی تشریع سے مقرر فرمایا ہے، اور اس اصل الاصول کی پابند ہے کہ "تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے"، اور "تمہارے درمیان جو نزاع بھی ہو اس میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو"۔ اس قاعدہ کلیہ کے لحاظ سے مسلمان شرعی معاملات میں اس امر پر تو مشورہ کر سکتے ہیں کہ کسی نص کا صحیح مفہوم کیا ہے، اور اس پر عمل درآمد کس طریقہ سے کیا جائے تاکہ اس کا منشا ٹھیک طور سے پورا ہو، لیکن اس غرض سے کوئی مشورہ نہیں کر سکتے کہ جس معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول نے کر دیا ہو اس میں وہ خود کوئی آزادانہ فیصلہ کریں۔

سورة الشّوریٰ حاشیہ نمبر: 62

اس کے تین مطلب ہیں:

ایک یہ کہ جو رزق حلال ہم نے انھیں دیا ہے اسی میں سے خرچ کرتے ہیں، اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے مال حرام پر ہاتھ نہیں مارتے۔

دوسرے یہ کہ ہمارے دیے ہوئے رزق کو سینت کر نہیں رکھتے بلکہ اسے خرچ کرتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ جو رزق انھیں دیا گیا ہے اس میں سے راہ خدا میں بھی خرچ کرتے ہیں، سب کچھ اپنی ہی ذات کے لیے وقف نہیں کر دیتے۔

پہلے مطلب کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف رزق حلال وطیب ہی کو "اپنے دیے ہوئے رزق" سے تعبیر فرماتا ہے۔ ناپاک اور حرام طریقوں سے کمائے ہوئے رزق کو وہ اپنا رزق نہیں کہتا۔ دوسرے مطلب کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو رزق انسان کو دیتا ہے وہ خرچ کرنے کے لیے دیتا ہے، سینت سینت کر رکھنے اور اس پر مار زر بن کر بیٹھ جانے کے لیے نہیں دیتا۔ اور تیسرے مطلب کی بنیاد یہ ہے کہ خرچ کرنے سے مراد قرآن مجید میں محض اپنی ذات پر اور اپنی ضروریات پر ہی خرچ کر دینا نہیں ہے، بلکہ اس کے مفہوم میں انفاق فی سبیل اللہ بھی شامل ہے۔ انہی تین وجوہ سے اللہ تعالیٰ خرچ کرنے کو یہاں اہل ایمان کی ان بہترین صفات میں شمار فرما رہا ہے جن کی بنا پر آخرت کی بھلائیاں انہی کے لیے مختص کی گئی ہیں۔

تفسیر تدبر القرآن ۔۔۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب

وہ صفات جن سے مذکورہ خوبیاں پیدا ہوئی ہیں

یہ ان صفات کا بیان ہے جن سے ان کے اندر وہ خوبیاں پیدا ہوئی ہیں جن کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ فرمایا کہ انھوں نے اپنے رب کی اس دعوت پر لبیک کہی ہے جو اس کے رسول کے واسطہ سے ان کو پہنچی ہے۔ قریش کے متکبرین کی طرح انھوں نے اس کو جھٹلانے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی اسی خوبی کی طرف اوپر آیت 26 میں اشارہ فرمایا ہے۔ ویستجیب الذین امنوا وعملوا الصلحت ویزیدھم من فضلہ (اور اس کو قبول کر رہے ہیں وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے اور اللہ ان کے لیے اپنے فضل میں افزونی فرمائے گا۔)

ایمان اکا اولین مظہر نماز ہے

وقاموا الصلوۃ یہ اس قبول کرنے یا بالفظ دیگر ان کے ایمان کے اولین مظہر کی طرف اشارہ ہے کہ وہ نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔ دین کی اس حقیقت کا اظہار اس کتاب میں ہر جگہ جگہ کرتے آ رہے ہیں کہ ایمان کا سب سے پہلا عملی مظہر نماز ہے۔ یہی اس کا اولین مظہر بھی ہے اور پھر اسی سے دوسری نیکیاں ظہور میں بھی آتی اور اسی سے پروان بھی چڑھتی ہیں۔ اس وجہ سے جس نے نماز کا اہتمام نہیں کیا اس نے گویا ایمان کی دعوت بھی قبول نہیں کی۔ اگر وہ ایمان کا مدعی ہے تو اس کا یہ دعویٰ محض خود فریبی ہے۔

یہاں اس حقیقت پر بھی نظر رہے کہ اقاموا الصلوۃ کا مفہوم صرف نماز پڑھنا ہی نہیں بلکہ نماز کا اہتمام کرنا بھی ہے۔ یعنی وہ نماز پڑھتے بھی ہیں اور یہ اہتمام بھی کرتے ہیں کہ دوسرے بھی نماز پڑھیں۔ یہی نماز اور اہتمام نماز ان کی جماعتی زندگی کی خصوصیت اور اس دنیا میں ان کا اصلی امتیاز ہے۔ یہی نماز ان کو سکھاتی ہے کہ ان کو دنیا میں اپنے رب کی بندگی اور اس کے دین کی اقامت کے لیے کس طرح بنیان مرصوص بن کر زندگی گزارنی ہے اور یہی نماز اس فحشاء اور منکر سے ان کو روکتی ہے جن سے اجتناب کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ نماز کی اس حقیقت کی طرف دوسرے مقام میں یوں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ ان الصلوۃ تنھی عن الفحشآء والمنکر (نماز بے حیائی اور ناروا باتوں سے روکتی ہے)۔۔ اس میں بھی قریش کے لیڈروں پر تعریض ہے کہ نماز تو انھوں نے برباد کر دی لیکن اس کے باوجود حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے بنائے ہوئے اس گھر کے وارث ہونے کے مدعی ہیں جو نماز اور اہتمام نماز کے ایک مرکز کی حیثیت سے تعمیر ہوا تھا۔

اہل ایمان کے سیاسی نظم کی بنیاد شوریٰ پر ہے

وامرھم شوری بینھم۔۔ شوری مصدر ہے فتیا کے وزن پر اور اس کے معنی آپس میں مشورہ کرنے کے ہیں، لفظ امر عربی میں ہمارے لفظ معاملہ کی طرح بہت وسیع معنوں میں آتا ہے۔ اس کے صحیح مفہوم کا تعین موقع و محل اور سیاق و سباق سے کرتے ہیں۔ یہاں قرینہ پتہ دے رہا ہے کہ یہ لفظ جماعتی نظم کے مفہوم میں آیا ہے۔ یعنی مسلمانوں کا جماعتی اور سیاسی نظم خود سری، انانیت، خاندانی برتری، نسبی غرور پر مبنی نہیں ہے بلکہ اہل ایمان کے باہمی مشورہ پر مبنی ہے۔ اس میں قریش کے نظم سیاسی و اجتماعی پر جو تعریفض ہے وہ محتاج وضاحت نہیں ہے اس لیے کہ ان کا نظم اجتماعی تمام تر خاندانی اور نسبی امتیاز پر قائم تھا۔ اسلام کی مخالفت کا ایک بڑا سبب ان کے لیے یہ بھی تھا کہ وہ اس دعوت کے فروغ پانے کی صورت میں اپنے اس جاہلی نظام کی موت سمجھتے تھے۔ قرآن نے اس آیت میں ایک طرف تو مسلمانوں کو یہ بشارت دے دی کہ ان کے لیے ایک ہئیت اجمتاعی و سیاسی کی شکل میں منظّم ہونے کا وقت آ گیا اور یہ نظم اجتماعی نسب اور خاندان کی اساس کے بجائے اہل ایمان کے باہمی مشورہ پر مبنی ہو گا، دوسری طرف درپردہ قریش کے لیڈروں کو یہ آگاہی بھی دے دی کہ اب تم خواہ کتنا ہی زور اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں صرف کرو لیکن انہی کمزور و مظلوم مسلمانوں کے ہاتھوں وہ نیا نظام آ رہا ہے جو تمہارے اس فاسد نظام کی بساط الٹ کر رکھ دے گا۔

شوریٰ کی اہمیت کا ایک خاص پہلو

یہاں شورائی نظام کی خصوصیات اور اس کے اصول و مبادی پر بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث ہم اپنی کتاب ۔۔ اسلامی ریاست ۔۔ کی ایک مستقل فصل میں کر چکے ہیں۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔ البتہ ایک سوال یہاں قابل غور ہے کہ قرآن کا معروف اسلوب بیان تو یہ ہے کہ وہ نماز کے ساتھ بالعموم زکوۃ یا انفاق کا ذکر کرتا ہے لیکن یہاں اس معروف طریقہ کے خلاف نماز اور انفاق کے بیچ میں شوریٰ کا ذکر آ گیا ہے آخر شوریٰ کی اہمیت کا وہ خاص پہلو کیا ہے جس کی بنا پر اس کو نماز کے پہلو میں جگہ دی گئی؟

اسلام کا نظم اجتماعی نماز کی صورت میں شکل کیا گیا

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام کے نظم اجتماعی کی روح اور اس کے قالب کی اصلی شکل نماز میں محفوظ کی گئی ہے۔ اسی کے اندر مسلمانوں کو دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ان کو اللہ کی بندگی کے لیے ایک بنیان مرصوص بن کر کھڑے ہونا ہے کس طرح اپنے اندر سے سب سے زیادہ علم و تقویٰ والے کو اپنی امامت کے لیے منتخب کرنا ہے، کس طرح لوگوں کو حدود الٰہی کے اندر اس امام کی بے چون وچرا اطاعت کرنی ہے اور کس طرح امام اس بات کا پابند ہے کہ لوگوں کو کسی ایسی بات کا حکم نہ دے جو اللہ اور رسول کے کسی حکم کے خلاف ہو اور کس طرح اس کے ایک ادنیٰ مقتدی کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ کوئی غلطی کرے تو وہ اس کو ٹوک دے یہاں تک کہ عین نماز کے اندر بھی رکوع، سجود، قیام، قعود یا تلاوت میں کوئی ادنیٰ فروگزاشت بھی اس سے صادر ہو جائے تو اس کے پیچھے ہر نماز پڑھنے والا اس کو متنبہ کرنے کا ذمہ دار ہے اور امام کا یہ فرض ہے کہ اگر مقتدی کی تنبیہ مطابق شریعت ہے تو وہ اس کو قبول اور اپنی غلطی کی فوراً اصلاح کرے۔ گویا اس طرح ہمارا پورا نظم اجتماعی نماز کی صورت میں مشکل کر کے ہمیں یہ دکھایا گیا کہ ہم اپنی سیاسی تنظیم میں اسی نمونہ کی پیروی کریں۔ اسی طرح اللہ کے دین کی اقامت کے لیے اپنی تنظیم کریں، اسی طرح اپنے اندر سے سب سے زیادہ اہل اور صاحب علم و تقویٰ کو اپنی قیادت کے لیے منتخب کریں، اسی طرح تمام معروف میں بے چون وچرا اس کی اطاعت کریں اور اگر اس سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو شریعت کے معروف کے خلاف ہو تو بے خوف لومۃ لائم اس کو متنبہ کر کے اس کو صحیح راہ پر لانے کی کوشش کریں۔

نماز اور ہمارے سیاسی نظام کا یہ تعلق ہے جس کے سبب سے قرآن نے ٹھیک اس وقت جب مسلمان ایک ہئیت اجتماعی کی شکل اختیار کرنے والے تھے، ان کی رہنمائی شوریٰ کی طرف فرمائی اور اس شوریٰ کا ذکر نماز کے پہلو بہ پہلو کر کے ایک طرف تو اس کی عظمت نمایاں فرمائی کہ دنی میں اس کا کیا درجہ و مرتبہ ہے اور دوسری طرف اس کی تشکیل کی نوعیت بھی واضح فرمادی کہ اس میں امیر و مامور کے حقوق و فرائض کی صورت کیا ہو گی، کس طرح کے لوگ اس کی رکنیت کے لیے موزوں ہوں گے، جماعت اور خلق خدا سے متعلق ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوں گی اور ان کی اصلی مسؤلیت کس کے آگے ہو گی۔

شوریٰ کی اہمیت اور نماز کے ساتھ اس کے تعلق کا یہی پہلو تھا کہ عہد رسالت اور خلافئے راشدین کے دور میں اس کا انعقاد مسجد ہی میں ہوتا تھا۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے متعلق تو سیرت کی کتابوں میں یہ روایت بھی ملتی ہے کہ وہ شوریٰ کے انعقاد کا اعلان الصلوۃ جامعۃ کے الفاظ سے کرتاے تھے۔ یعنی اہل شوریٰ نماز کے لیے جمع ہوں۔ جب اہل شوریٰ مسجد میں جمع ہو جاتے تو وہ دو رکعت نماز ادا کتے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ نماز پڑھتے تھے تو دور سے اہل شوریٰ بھی ان کی اقتدار میں نماز پڑھتے رہے ہوں گے۔ نماز اور دعا کے بعد حضرت عمر مسئلہ زیر بحث پیش کرتے اور اہل شوریٰ اس پر اپنی رایوں کا اظہار کرتے اور خلیفہ کی رہنمائی میں کسی متفق علیہ نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔

یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کی رہنمئیا کے حصول کے پہلو سے بھی نہایت بابرکت ہے اور اسلام کے نظم سیاسی کی اصل روحی کے تحفظ کے نقطہ نظر سے بھی۔ لیکن اس دور میں مسلمانوں نے دوسری قوموں کی تقلید میں شورائی نظام کی جگہ نظام بھی دوسرے اختیار کر لیے اور مسجدوں سے بھی ان کا تعلق بالکل منقطع ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا کی رہنمائی سے محروم ہوگئے اور ان کی باگ شیطان اور اس کے ایجنٹوں کے ہاتھ میں چلی گی۔ اب پارلیمنٹوں کے ایوانوں میں جو دھینگا مشتی ہوتی ہے اس کی مثال بازاروں میں بھی مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

ومما رزقنھم ینفقون نماز کے ساتھ انفاق یاز کوۃ کے تعلق پر اس کتاب میں جگہ جگہ مفصل بحث ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی کا ایک ستون تو یہ ہے کہ اس کی نماز پڑھی جائے اور اس کا دوسرا استون یہ ہے کہ اس کے بخشے ہوئے رزق میں سے اس کی راہ میں خرچ کیا جائے۔ پہلی چیز بندے کا تعلق اس کے خالق سے اسوتار کرتی ہے۔ دوسری چیز خلق سے اس کو جوڑتی ہے اور انہی دونوں اساسات پر تمام شریعت قائم ہے۔

آیت۔۔۔۳۹

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝۳۹

اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں 63۔۔

تفسیر تفہیم القرآن۔ مولانا مودودی

سورۃالشُّورٰی حاشیہ نمبر: 63

یہ بھی اہل ایمان کی بہترین صفات میں سے ہے۔ وہ ظالموں اور جباروں کے لیے نرم چارہ نہیں ہوتے۔ ان کی نرم خوئی اور عفو و در گزر کی عادت کمزوری کی بنا پر نہیں ہوتی انھیں بھکشوؤں اور راہبوں کی طرح مسکین بنکر رہنا نہیں سکھایا گیا ہے۔ ان کی شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ جب غالب ہوں تو مغلوب کے قصور معاف کر دیں، جب قادر ہوں تو بدلہ لینے سے در گزریں، اور جب کسی زیر دست یا کمزور آدمی سے کوئی خطا سرزد ہو جائے تو اس سے چشم پوشی کر جائیں، لیکن کوئی طاقتور اپنی طاقت کے زعم میں ان پر دست درازی کرے تو ڈٹ کر کھڑے ہو جائیں اور اس کے دانت کھٹے کر دیں۔ مومن کبھی ظالم سے نہیں دبتا اور متکبر کے آگے نہیں جھکتا۔ اس قسم کے لوگوں کے لیے وہ لوہے کا چنا ہوتا ہے جسے چبانے کی کوشش کرنے والا اپنا ہی جبڑا توڑ لیتا ہے۔

تفسیر تدبر القرآن ۔۔۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب

اوپر آیت 37 میں یہ جو ارشاد ہوا ہے کہ "واذا ما غضبوا ھم یغفرون ' یہ اسی پر ایک قسم کا استدراک ہے کہ اول تو وہ مخالفوں کی غصہ دلانے والوں باتوں سے در گزر کرتے ہیں اور اگر کوئی جوابی کارروائی کرتے بھی ہیں تو اس وقت جب ان پر کوئی صریح زیادتی کی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کس تعدی کے دفاع

اور اس کے انتقام کا حق ہر شخص کو حاصل ہے اور اس حق سے وہ بھی فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن یہ نہیں ہے کہ ہر بات کو کسی اقدام کا بہانہ بنالیں بلکہ وہ بدلہ لیتے ہیں تو کسی بغی کا لیتے ہیں۔ بغی مخالف کی کسی کھلی ہوئی تعدی، سرکشی اور زیادتی کو کہتے ہیں۔

آیت۔۔۔۴۰

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝۴۰

برائی 64 کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے 65، پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے 66، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا 67۔

تفسیر تفہیم القرآن۔ مولانا مودودی

سورۃالشّوریٰ حاشیہ نمبر: 64

یہاں سے آخر پیراگراف تک کی پوری عبارت آیت ماسبق کی تشریح کے طور پر ہے۔

سورۃالشّوریٰ حاشیہ نمبر: 65

یہ پہلا اصولی قاعدہ ہے جسے بدلہ لینے میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ بدلے کی جائز حد یہ ہے کہ جتنی برائی کسی کے ساتھ کی گئی ہو، اتنی ہی برائی وہ اس کے ساتھ کرلے، اس سے زیادہ برائی کرنے کا وہ حق نہیں رکھتا۔

سورۃالشّوریٰ حاشیہ نمبر: 66

یہ دوسرا قاعدہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زیادتی کرنے والے سے بدلہ لے لینا اگرچہ جائز ہے، لیکن جہاں معاف کر دینا اصلاح کا موجب ہو سکتا ہو وہاں اصلاح کی خاطر بدلہ لینے کے بجائے معاف کر دینا زیادہ بہتر ہے۔ اور چونکہ یہ معافی انسان اپنے نفس پر جبر کر کے دیتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کا اجر ہمارے ذمہ ہے، کیونکہ تم نے بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پیا ہے۔

سورۃالشّوریٰ حاشیہ نمبر: 67

اس تنبیہ میں بدلہ لینے کے متعلق ایک تیسرے قاعدے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کسی شخص کو دوسرے کے ظلم کا انتقام لیتے لیتے خود ظالم نہیں بن جانا چاہیے۔ ایک برائی کے بدلے میں اس سے بڑھ کر برائی کر گزرنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی کو ایک تھپڑ مارے تو وہ اسے ایک تھپڑ مار سکتا ہے۔ لات گھونسوں کی اس پر بارش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح گناہ کا بدلہ گناہ کی صورت میں لینا درست نہیں ہے۔ مثلاً کسی شخص کے بیٹے کو اگر کسی ظالم نے قتل کیا ہے تو اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جا کر اس کے بیٹے کو قتل کر دے۔ یا کسی شخص کی بہن یا بیٹی کو اگر کسی کمینہ انسان نے خراب کیا ہے تو اس کے لیے حلال نہیں ہو جائے گا کہ وہ اس کی بیٹی یا بہن سے زنا کرے۔

تفسیر تدبر القرآن۔۔۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب

انتقام میں توازن

پھر یہ کہ بدلہ لیتے بھی ہیں تو یہ نہیں کرتے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش کیں۔ بلکہ وہ اس معاملے میں بھی پورا توازن قائم رکھتے ہیں۔ جواب میں صرف اتنی ہی کارروائی کرتے ہیں جو برائی کے ہم وزن ہو۔

کوئی انتقامی کارروائی کوئی برائی نہیں ہے بلکہ قصاص ہے لیکن یہاں اس کو سیءۃ کے لفظ سے عربی زبان کے اس اسلوب کے مطابق تعبیر کیا گیا ہے جس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے کہ بعض اوقات الفاظ مجانست کے اصول پر استعمال ہوتے ہیں، مثلاً دناھم کمادنورا، ظاہر ہے کہ اس میں کمادانوا بالکل کما فعلوا کے معنی میں ہے لیکن محض ہم آہنگی کے پہلو سے کما فعلوا کی جگہ کمادانوراا استعمال ہوا۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ کسی کے خلاف انتقامی کارروائی میں بھی کسی ایسے فعل کا ارتکاب جائز نہیں ہے جو شریعت میں بہر شکل ممنوع ہے۔

انفرادی معاملات میں پسندیدہ روش اصلاح کی ہے

فھن عفاد اصلح فاجرہ علی اللہ یعنی ہر چند اس بات کا حق تو ہر شخص کو حاصل ہے کہ اس پر تعدی کی گئی ہے تو وہ تعدی کے بقدر انتقام لے لے لیکن اس سے اعلیٰ رویہ ان لوگوں کا ہے جو درگزر کریں اور معاملہ کو اصلاح کی راہ سے طے کرنے کی کوشش کریں۔ اصلاح کی راہ اختیار کرنے میں اگرچہ جذبات کی قربانی کرنی پڑتی ہے لیکن اس کا اجر بہت بڑا ہے جس کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ عام انفرادی واقعات میں زیادہ پسند اللہ تعالیٰ کو اصلاح ہی کا طریقہ ہے خواہ دونوں فریق خود باہم گر اصلاح و تلافی کی کوشش کریں یا دوسروں کو اس کا ذریعہ بنائیں یا دوسرے از خود بیچ میں پڑ کر مصالحت کرا دیں۔

انتقام صرف لقدر تعدی جائز ہے

انہ لایحب الظلمین یہ ایک جامع تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی اگر کوئی شخص کسی پر تعدی کرے تو وہ بھی اللہ کے نزدیک مبغوض اور اگر کوئی کسی کی تعدی کا جواب اس سے بڑھ کر تعدی سے دینے کی کوشش کرے تو وہ بھی مبغوض پسندیدہ روش اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ تعدی کی اصلاح کی کوشش کی جائے اور اگر یہ نہیں تو بقدر تعدی اس کا انتقام لیا جائے۔

آیت۔۔۔ ۴۱

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ؕ۴۱

اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان کو ملامت نہیں کی جا سکتی،

تفسیر تدبر القرآن ۔۔۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب

بعد ظلمہ میں مصدر اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے جس طرح سورۃ روم کی آیت وھم من بعد غلبھم سیغلبون (۳) ہے۔

ان لوگوں کے شبہ کا جواب جو انتقام کو دینداری کے خلاف سمجھتے ہیں

یہ ان لوگوں کے شبہ کا جواب ہے جو دینداری کا ایک تقاضا یہ بھی سمجھتے ہیں کہ آدمی دوسروں کے ہاتھوں پٹتا رہے اور ان سے کوئی انتقام نہ لے۔ اگر کوئی انتقام لے تو یہ چیز دینداری کے خلاف سمجھی جاتی ہے اور اس کو بھی برابر کا مجرم سمجھ لیا جاتا ہے۔ فرمایا کہ اس طرح کے معاملات میں الزام ان لوگوں پر نہیں ہے جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کئے جانے کے بعد انتقام لیا بلکہ الزام ان لوگوں پر ہے جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور بلا کسی استحقاق کے خدا کے زمین میں سرکشی اور طغیان کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

بغیر الحق، یعنی زمین کا خلاق اور مالک تو خدا ہے، ان کا کوئی دخل نہ اس کی تخلیق میں ہے نہ تدبیر میں۔ لیکن ان کا مطالبہ ہے کہ کوئی ان کے آگے سر اٹھا کے نہ چلے۔ فرمایا کہ اصل مجرم یہ لوگ ہیں اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اگر ان کے جواب میں مظلوموں کو بھی کوئی اقدام کرنا پڑے تو اس کی مسؤلیت

ان مظلوموں پر نہیں بلکہ ان ظالموں ہی پر ہے جنہوں نے اس کی طرح ڈالی۔ سورۃ مائدہ کی آیت الی ارید ان تبوا٫ باثمی واثمہ (29) کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

آیت۔۔۔ ۴۲

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝٤٢

ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تفسیر عروہ الوثقی

ظلم اس زیادتی کو کہا جائے گا جو "بغیر حق" ہو گا

۴۲؎ ظلم اور زیادتی اسی بات کو کہا جا سکتا ہے جو ابتداً "بغیر حق" کسی شخص پر کی جائے اگر کوئی شخص اپنے اوپر کیے گئے ظلم کا بدلہ یا انتظام لیتا ہے تو یہ انتقام لینا اس کا حق ہے جس طرح اپنے حق کو چھوڑ دینا کمال کی بات ہے اسی طرح انتقام لے لینا بھی جائز اور درست ہے اگر انتقام اور بدلہ لینا بالکل بینا جائز اور حرام قرار دیا جاتا تو زمین میں فساد بپا ہو جاتا اور بغاوت فی الارض کا کوئی علاج ہی ممکن نہیں تھا اس لیے ظلم اور زیادتیاں کرنے والوں اور فساد فی الارض کے مرتکبین کو سیدھی راہ پر لانے کے لیے ان کو بدلہ و انتقام سے دوچار کر دینا قابل مذمت نہیں بلکہ قابل تعریف عمل ہے۔ خصوصاً جب ظلم و زیادتی کرنے والے برے لوگ ہوں جن سے انتقام یا بدلہ لینا نہایت مشکل بات سمجھی جائے تو ان کو ان کے ظلم کا بدلہ چکھانا نا قابل تعریف عمل ہے کیونکہ ایسے لوگوں کو عذاب الیم یعنی ایک دردناک عذاب میں مبتلا کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ فساد فی الارض کا انسداد اور روک تھام کی جائے اس کی مزید وضاحت دیکھنا چاہیں تو عزوۃ الوثقی جلد چہارم میں سورۃ النساء کی آیت 141 اور سورۃ المائدہ کی آیت 29 کی تفسیر دیکھیں۔

آیت 36 تا 42 کی بحث کا خلاصہ قرآن کریم کی نظر میں

۴۳؎ زیر نظر آیت اور گزشتہ آیتوں میں جو ایمان والوں کی صفات بیان کی گئی ہیں ان کا خلاصہ ایک بار قارئین کے سامنے دوبارہ پیش کر رہی ہے کہ ا۔ بلاشبہ ظلم و زیادتی کا بدلہ و انتقام ہر زیادتی کی جانے والے اور ظلم کیے جانے والے انسان کا ایک فطری حق ہے اور حق دار کا حق وصول کر لینا قابل مذمت نہیں ہو سکتا۔ ہاں! اپنا حق وصول کر لینے کی طاقت و قوت موجود ہونے کے باوجود اگر کوئی شخص اپنا حق وصول نہیں کرتا بلکہ معاف کر دیتا ہے یا چھوڑ دیتا ہے تو یہ بات نہایت مستحسن جس کو درگزر کر جانے یا صبر کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ۲۔ اگر کوئی شخص اپنے اوپر کی گئی زیادتی کا بدلہ نہیں لیتا تو بلاشبہ ایسے لوگوں کو "صابر" کہا جائے گا اندریں صورت اگر کوئی "صابر" کہلانا چاہے اور اپنے صبر کا اجر اللہ سے چاہتا ہو تو یقیناً اس کو اس کے صبر کا اجر ملے گا۔ ۳۔ اگر ظلم و زیادتی کرنے والا شخص زیادہ طاقتور اور بڑا آدمی ہے تو اس سے بدلہ و انتقام لینا شجاعت اور بہادری کی علامت ہے اگر ایسے لوگوں پر انتقامی کارروائی کی جائے تو اس طرح فساد فی الارض رکتا ہے لہٰذا ان لوگوں کو ان کے کیے کا بدلہ چکھانا عزیمت کا کردار ادا کرنا ہے۔ ۴۔ کمزور سے اپنا حق وصول کرنا اور طاقتور کو اپنا حق معاف کر دینا کوئی کمال کی بات نہیں بلکہ بزدلی کی ایک علامت ہے جو قابل ستائش نہیں ہو سکتی اور اس کا عکس شجاعت اور بہادری ہے کہ انسان اپنے سے کمزور کی زیادتی کو برداشت کرتے ہوئے اس سے انتقام و بدلہ نہ لے بلکہ اس کو بلا شرط معاف کر دے بلاشبہ یہ اولوالعزم کاموں میں سے ایک کام ہے اور صبر و سہارے سے کام لینا اور کمزوروں سے درگزر اختیار کرنا نہایت ہی خوبی کی بات ہے جس کو حاصل کرنے کی کوشش ایک مستحسن عمل ہے اور مجموعی طور پر ہر اچھی عادت اللہ تعالیٰ سے طلب کرتے رہنا چاہیے۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

آیت ۔۔۔۴۳

وَلَمَنۡ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ۝۴۳

البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور در گزر کرے تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے 68۔ ع

تفسیر تفہیم القرآن۔ مولانا مودودی

سورۃالشُّوریٰ حاشیہ نمبر :68

واضح رہے کہ ان آیات میں اہل ایمان کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ اس وقت عملاً رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے اصحاب کی زندگیوں میں موجود تھیں، اور کفار مکہ اپنی آنکھوں سے ان کو دیکھ رہے تھے۔اس طرح اللہ تعالیٰ نے دراصل کفار کو یہ بتایا ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی بسر کرنے کا جو سر و سامان پا کر تم آپے سے باہر ہوئے جاتے ہو، اصل دولت وہ نہیں ہے بلکہ اصل دولت یہ اخلاق اور اوصاف ہیں جو قرآن کی رہنمائی قبول کر کے تمہارے ہی معاشرے کے ان مومنوں نے اپنے اندر پیدا کیے ہیں۔

تفسیر تدبر القرآن ۔۔۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب

خلاصہ بحث

یہ آیت یہاں غلاصہ بحث کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے کئی باتیں واح ہوئیں۔ایک یہ کہ اگرچہ تعدی کے بقدر انتقام کا حق ہر شخص کو حاصل ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک دوسری یہ کہ یہ در گزر صرف وہی لوگ کر سکیں گے جن کے اندر صبر کی خصلت ہو گی۔ جن کے اندر یہ صفت نہیں ہے وہ یہ بازی نہیں کھیل سکیں گے۔اس وجہ سے لوگوں کو اپنے اندر صبر کی صفت راسخ کرنی چاہیے۔

تیسری یہ کہ یہ کردار عزیمت کا کردار ہے۔ جو لوگ یہ کردار اپنے اندر پیدا کریں گے وہ ارباب عزیمت میں ہیں۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ ان باتوں کی طرف مسلمانوں کی رہنمائی ان حالات کے مقابلہ کے لیے کی گئی ہے جن سے وہ قریش کے ہاتھوں قرب ہجرت کے زمانے میں دوچار تھے اس وقت تک مسلمان نہ تو ایک منظم سیاسی طاقت بنے تھے اور نہ ابھی قریش پر دین کی حجت ہی پوری طرح تمام ہوئی تھی۔ ہجرت کے بعد جب مسلمان ایک منظم طاقت بن گئے اور قریش پر حجت تمام ہو گئی تو مسلمانوں کو من حیث الجماعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ہوئی کہ اب مسلمان ان سے کلیتہ اپنے تمام روابط منقطع کر لیں اور اس وقت تک ان سے جنگ جاری رکھیں جب تک یہ اسلام کے آگے سپر نہ ڈال دیں۔